دسمبر ۸۵ 1/-

ماہنامہ

پیکرِ خوشبو

کرنول



کہا پھولوں نے یہ اہلِ چمن سے
ہماری طرح تم بھی جینا سیکھو (سوزؔ بیدری)

ماهنامہ **پیکرِ خوشبو** کرنول

ایڈیٹر **یونس انجم عمری**

دسمبر ۱۹۸۵ء

جلد - ۱ اشاعت - ۱

ناشر: ادارہ کاروانِ ادب، کرنول

طباعت: اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد ۲

قیمت: فی کاپی: 3 روپئے

سالانہ: 30 روپئے

اعزازی: ۱۰۰ روپئے

فہرست

PAIKAR-E-KHUSHBOO

30/109, CHITTARI STREET

KURNOOL 518001

بسم اللہ

رنگ و بُو

کرنول جسے بغدادِ دکن بھی کہا جاتا ہے ریاست آندھرا پردیش کا وہ زرخیز اور شاداب علاقہ ہے جہاں علم وفضل اور شعر وادب کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سرزمین کی کوکھ نے بے شمار اہل قلم، اہل فن کو جنم دیا ہے جن کی شبانہ روز کوششوں اور کاوشوں نے اس سرزمین کو علم ادب کا جنت نشاں بنا دیا ہے۔ اسی علم وادب کا فیضان ہے کہ یہاں سے اردو کا پہلا ماہنامہ "شاہین" جاری ہوا اور پھر دوسرے ماہنامے کی صورت میں "پیکرِ خوشبو" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اردو ایک مظلوم زبان ہے صرف کسی زبان کی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے سے زبانیں زندہ نہیں ہوتیں۔ ان کی مظلومی کا ماتم کرکے ہم ان کی ترقی سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔ افسوس کہ اردو کے تعلق سے اسی قسم کا رویہ اب تک اختیار کیا گیا ہے۔ عملاً کسی زبان کو زندہ رکھنے کے لئے جو کام ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہو سکا۔ ایسے مایوس کن حالات میں ایک اردو ماہنامے کی اجرائی کا خیال ہی آفتوں اندیشوں کو جنم دیتا ہے لیکن ان تمام باتوں کی پرواہ کئے بغیر "پیکرِ خوشبو" کو آپ کے ہاتھوں میں پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ سوچ کر کہ کروڑوں انسانوں کی دھڑکن "اردو" کبھی مر نہیں سکتی۔ اس کے چاہنے والے اس سے محبت کرنے والے ہر جگہ موجود ہیں۔ اور جب تک اس زبان میں ایسے ماہنامے، رسالے نکلتے رہیں گے وہ کوئی مظلوم زبان نہیں ہو سکتی۔

ہم نے اس کو خوبصورت اور دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے اور مزید دلچسپ اور خوبصورت بنانے کے لئے آپ کے قیمتی مشوروں کا انتظار رہے گا۔ ہم ہر قسم کے علاقائی تعصب اور تنگ نظری سے بلند ہو کر تمام اہل قلم سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔ اور قارئین سے بھی ملتمس ہیں کہ "پیکرِ خوشبو" کی توسیع اشاعت میں ہماری ہر ممکنہ امداد فرمائیں۔ جس کی بہترین صورت سالانہ خریداری قبول فرمانے میں ہوگی۔

اچھا آپ سب سے اگلے ماہ تک کے لئے .... خدا حافظ

اُردو پائندہ باد

آپ کا مخلص

یونس انجم

مدیر

قطعہ از عثمان شاہین

اُف یہ خوشبوئے گل ارے توبہ
ذہن کی راکھ پھر کریدے گی
پھر سے ماضی کے سب جواہر کو
دل کے بازار میں بکھیرے گی

فیض احمد فیض

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے !!
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

قطعات

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

وقفِ حرماں و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو!
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

دلِ رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

انسان اور عقیدۂ آخرت

حافظ محمد اسمٰعیل عمری

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (مومنون ۔ ۱۱۵) کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یونہی بے فائدہ ۔ خالی از حکمت ۔ پیدا کیا ہے ۔ اور یہ کہ تم ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آؤ گے ۔"

لفظ آخرت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دراصل یہ اس دنیائے فانی کا آخری اور آنے والی زندگی کا پہلا اور آخری دن ہوگا ۔ پہلا اور آخری اس اعتبار سے کہ از ابتداء تا انتہا یہ ایک کامل دن ہوگا ۔ اس کا کوئی ثانی نہ ہوگا ۔

امکانِ آخرت از روئے عقل :- ایک خدا بیزار اور ملحد انسان کے نزدیک اس حسین و جمیل کائنات کا مقصد تخلیق یہی ہے کہ اس کے حسن و جمال میں کھو جاؤ ۔ اسکی رنگینیوں میں گم ہو جاؤ ۔ شباب و شراب کے جام لنڈھاؤ اور یاد رکھو ۔ " بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست " ظاہر بات ہے کہ جس کا نظریہ اس دنیا کے تعلق سے اس قسم کا ہوگا اس سے اس سے اخلاق و کردار کے اچھے اور بے ضرر نمونہ کی توقع رکھنا فضول ہے ۔ ایسا شخص جنسی ہوس کی تسکین کیلئے عفت مآب بہن بیٹیوں کی عزت و آبرو سے کھلواڑ کرتا ہے ۔ عزت و اقتدار کے حصول کیلئے بے شمار معصوم انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے درندگی اور سفاکیت کا کھلے بندوں مظاہرہ کرتا ہے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے ایک سلیم الفطرت کے قلبِ سلیم میں یہ داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے خاطی انسان کو اس کے گھناؤنے کردار کی قرار واقعی سزا دی جانی چاہئیے ۔ مظلوم کی دادرسی کی جانی چاہئے ۔ کھلی عدالت قائم ہو بےلاگ فیصلے ہوں ۔ لیکن اس مکر و دغا کی دنیا میں ایک شخص دھڑلے سے کسی کو قتل کرتا ہے اور عدالت محض یہ کہکر اس کو بری قرار دیتی ہے کہ ملزم کے خلاف واضح گواہ موجود نہیں ہیں ۔ کیا مظلوم و مقتول کو یہی انصاف ملا ہے کہ اسکا قاتل دھرتی پر دندناتے پھر رہا ہے ۔ کوئی تھا جسکے درندہ صفت ہاتھوں سے قتل ہوا آخر اسکو انصاف کہاں ملے گا ۔ ! چاہے نیشنل عدالت ہو یا انٹرنیشنل ۔ بس انسانی عدالتیں ہیں ۔ جہاں مظلوم کو بہت کم انصاف ملتا ہے ۔ اور ظالم کی ضرورت سے زیادہ بہت افزائی ہوتی ہے ۔ ان حالات میں ایک حقیقت پسند انسان کے ضمیر کی یہ آواز ہوگی کہ واقعی خدائی عدالت قائم ہو جس کے بارے کہا گیا کہ " لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا " جہاں ہر چھوٹا اور بڑا جرم پیش ہوگا ۔ یہ ایک قریب الفہم عقلی دلیل ہے جو امکانِ آخرت کو سمجھنے کیلئے کافی ہے ۔ عقل و خرد کے حامل انسان کے لئے ۔ !

بعث بعد الموت از روئے نقل :- قرآنِ حکیم میں وقوع قیامت کے امکان کو ثابت کرنے کیلئے خالق حکیم نے مختلف انداز اختیار کئے ہیں۔ منطق اور علم معقول کے اصولوں کے ذریعہ سمجھایا گیا۔ اور اسلوب انتہائی آسان اور واضح اختیار کیا گیا کہ مخاطب کا عقل و خرد کو ایک زبردست چوکا لگے کہ اتنی سامنے کی بات کو میں اتبک سمجھنے سے قاصر رہا۔ صانعِ عالم نے جو چیز پہلی مرتبہ بنائی ہے از خود اسے توڑ کر دوبارہ بنانا اس کے لئے کوئی مشکل اور محال نہیں ہے بلکہ دوسری مرتبہ نقش اول کو بہت جلد اور بہترین بنا سکتا ہے۔

"- وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۔" (روم - ٢٧)

" اور وہی ہے جو خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے پھر وہی اسے دوبارہ پیدا کریگا۔ اور یہ اسکو بہت آسان ہے۔"

" مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۔ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ "

(الیٰسین ٧٨ - ٧٩) جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائینگی توانکو کون زندہ کریگا - ؟ اے پیغمبر (کہہ دیجئے کہ ان کو وہ زندہ کریگا۔ جس نے انکو پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

اور کہیں انسانوں اور جانوروں کے سونے اور سو کر اٹھنے سے استدلال کرتے ہوئے کہا گیا کہ سونا موت ہے سو کر بیدار ہونا ایک طرح موت کے بعد زندہ ہونا ہے۔ جب مختصر موت کے بعد جی کر اٹھ سکتا ہے تو طویل موت کے بعد زندہ ہونا کیوں ممکن نہیں۔ ؟

بہر کیف اس موضوع پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے اور یہاں اسکا موقع نہیں ہے۔ اس لئے یہاں صرف عقل و نقل کی صرف ایک آدھ مثال پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ امکانِ آخرت پر یقین کرنا ایمان کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ کوئی شخص خدا اور دیگر غیبی امور پر ایمان و یقین رکھے لیکن آخرت کے بارے میں شک کرے یا انکار کرے تو اسکا ایمان مقبول نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی خدا کی مرضی کے کام کرے اسلامی عبادات و معاملات کا پابند ہو لیکن قیامت کو قطعاً نہ مانے بھی تو ایسے شخص کو اپنے ایمان و اعمال کی خیر منانی چاہیئے۔ اسلیئے کہ آخرت کی جواب دہی کا تصور ایسا ہیبت ناک تصور ہے کہ اسکی ہولناکی کو مدِ نظر رکھ کر آدمی زندگی گذارے تو دنیا میں کوئی ستایا نہ جائیگا۔ کسی پر ظلم نہ ہو۔ کسی کا قتل نہ ہو۔ جنسی انارکی

: جواہر پارے

فقیر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو دنیا نے ٹھکرا دیا۔
دوسری قسم وہ جنہوں نے دنیا کو ٹھکرا دیا

کو چھوٹ نہ ملے۔ دنیا میں ہر چہار طرف امن اور شانتی کا بول بالا ہو۔ عقیدہ آخرت شیر کو بکری کا محافظ بنا دیگا۔ ظلم کرنیوالا سوچیگا کہ ظلم کرونگا تو آخرت میں جواب دہی کیلئے پیش ہونا پڑیگا۔

بقولِ حضرت علیؓ کے عقلمندی یہ ہے کہ عمل کرتے جاؤ۔ اگر قیامت واقع ہوگی تو سستے داموں چھوٹ جاؤگے ورنہ عمل نہ کرکے پھنس جاؤگے۔ اور اگر قیامت محض ایک ڈھونگ، ڈھکوسلہ تھی تو کوئی بات نہیں مٹی میں رل مل کر ختم ہو جاؤگے۔ ایک طبیب اور ایک نجومی نے آپؓ سے کہا کہ قیامت بس ایک فریب ہے ہم اسکو تسلیم نہیں کرتے تو آپ نے فرمایا کہ۔

"اِنْ صَحَّ قَوْلُکُمَا فَلَسْتُ بِخَاسِرٍ
وَاِنْ صَحَّ قَوْلِیْ فَالْوُبَالُ عَلَیْکُمَا"۔

ترجمہ:۔ اگر تمہاری بات صحیح ثابت ہوئی اور قیامت نہ آئی تو میں گھاٹے میں نہ رہوں گا۔ اور اگر میری بات صحیح ثابت ہوئی اور قیامت واقع ہو کر رہی تو تمہاری جان خطرے میں پڑ جائیگی۔

وَاَنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ لَّا رَیْبَ فِیْھَا وَاَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ۔

ضرور قیامت آنے والی ہے جس میں کوئی شک نہیں اور بلاشبہ سب لوگوں کو جو قبروں میں ہیں جلا اٹھائیگا۔

۹

سانولی شام کی خوشبو

آشم مرزا

اس نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

وہ کئی دن سے محسوس کر رہا تھا کہ گھر میں اسکی حیثیت ایک ناکارہ پرزے سے زیادہ نہیں رہی اسکے خواب تیز ہوا کی زد میں آئے ہوئے سوکھے پتوں کی مانند ہچکیاں لیتے ہوئے بکھر گئے تھے۔ اپنی طرف سے گذشتہ ایک سال میں اس نے مختلف دفاتر میں ملازمت کیلئے اتنے چکر کاٹے تھے۔ اتنی عرضیاں دی تھیں کہ چپل بار بار ٹوٹنے کے بعد ناکارہ ہوگئی تھی۔ اور بڑے بھائیوں نے تنگ آکر صاف کہدیا تھا کہ اب وہ اسٹیشنری کا مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ رات کو وہ تخیلات کی سنہری زنجیر میں جکڑے ہوئے حدود شہر فسوں میں مقید شہزادی کی آہ وزاری کی آواز سنکر اس کی رہائی کے منصوبے بنا رہا تھا۔ کہ بڑی بھاوج کے کٹیلے لہجے نے اس کے شعور کی سطح پر کئی خواہشیں ڈال دی تھیں۔ اسکا بڑا بھائی منظور بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ زرینہ نے جب زہر خند کے ساتھ کہا۔ ”دیکھو جی اب بات برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ تمھارے نکھٹو بھائی کے پلے امینہ کو باندھکر میں ساری عمر کے لئے اس کی بد دعائیں نہیں لے سکتی۔ میری طرف سے یہ رشتہ ختم ہی سمجھو اور ہاں منصور سے کہو کہیں اور ٹھکانہ کرلے۔ مجھ سے اب اسکی کوئی خدمت نہیں ہوسکتی۔“ منظور بڑا سعادت مند شوہر تھا۔ بیوی کی ناراضگی مول لینے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے وعدہ کرلیا تھا کہ صبح منصور کو صاف لفظوں میں بستر گول کرنے کا حکم دے گا۔“ منصور کو بھابی کے اس سنگدلانہ رویہ کا خیال تک نہ آیا تھا۔ بیکاری کے باوجود امینہ ہی ایک ایسی ہستی تھی جس کے حصول کی خاطر وہ ملازمت کیلئے مسلسل تگ و دو کر رہا تھا۔ دونوں گھرانوں میں جو بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کی بدولت منصور نے زندگی کے ساتھی کے طور پر امینہ کا انتخاب کرلیا تھا۔ اور اس کے مستقبل کو تابناک بنانے کی خاطر ہی وہ ایسی ملازمت کی تلاش میں تھا جس کی بدولت وہ امینہ کے قدموں میں خوشیوں کے ڈھیر لگا دے۔ ایک ایسی زندگی کا آغاز کرے جس کی چمک دمک خیرہ کن ہو۔ اور جس میں زندگی کی ہر آسائش ان کے تابع ہو۔ مگر ایک سال کی تگ و دو کے بعد بھی اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اور بھابی کے نئے فیصلے کی بدولت اسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ اب وہ امینہ کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اور اگر محبت مرگئی تو اسکا زندہ رہنا بھی محال ہوگا۔ اور اس سے پہلے کہ امینہ ڈولی میں سوار ہو کر کسی دوسرے کے گھر کی رونق بنے وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے گا۔

الفاظ کا بھی ایک چہرہ ہوتا ہے اور چہرے پر سب کچھ نظر آتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے کہ سچ!

منظور اور زرینہ بہت دیر تک جاگتے رہے تھے۔ منصور بھی جاگ رہا تھا۔ اور پھر جب وہ دونوں سو گئے۔ تو ایک فیصلہ جست لگا کر اسکے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا۔ اب ہر لمحہ اس کے لئے ایک صدی بن گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ زندگی کی آخری رات ہے۔ رات کی بکھری ہوئی گھنی زلفوں میں آنسوؤں کے ستارے پروتے ہوئے اسکا وجود ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ وہ ہر ذرے میں زرینہ کی نفرت کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ کے کرب ناک دائروں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس کی تخلیق کا مقصد کیا تھا۔ وہ کیوں ڈگری حاصل کر کے بھی ہر منزل سے دور ہوتا گیا تھا!... جب ہر خواب کو راکھ کا ڈھیر ہی بننا تھا تو پھر شب بیداری کے عذاب کو شروع ہی سے اس کا مقدر کیوں بنا دیا گیا تھا!... کاش ــــ ہجر کے پچھلے پہر کی جلن اس کے ہونٹوں پر جم کر رہ گئی کروٹیں بدلتے ہوئے ہر آہٹ پر اسے موت کا گمان ہونے لگا تھا.... صبح کاذب کے وقت اتنا نڈھال ہو چکا تھا۔ کہ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اور سوچ کے دائرے ٹوٹنے لگے۔

اسے صبح کسی نے بھی جگانے کی کوشش نہ کی تھی۔ سب گھر والے اس سے لاتعلق ہو چکے تھے۔ جب وہ بیدار ہوا تو دھوپ دیواروں سے اتر کر صحن کو چھو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔ اور سر چکرا رہا تھا۔ اس کا بڑا بھائی کام پر جا چکا تھا اور بھابی مٹی کے تیل کے چولہے کو بجھا کر اندر کمرے میں چھوٹے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ منصور آہستہ سے چارپائی پر سے اٹھا۔ اور در و دیوار پر حسرت بھری نظر ڈال کر باہر گلی میں آ گیا... سرکاری نل کی ٹونٹی کھولی۔ تو پانی قطرہ قطرہ گرنے لگا۔ اس نے چلو نیچے کر دیا۔ جب پانی جمع ہو گیا تو اس نے منہ دھویا۔ اور اپنے اندر کوئی بشاشت محسوس نہ کرتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے بازار کی طرف بڑھنے لگا۔

"ہاں باپ کی نعمت بھی عجیب ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو کیا مجھے گھر سے یوں بغیر ناشتہ کئے نکلنے کی اجازت مل سکتی تھی۔! خاص طور پر امی تو مجھے زندگی کے کسی موڑ پر بھی اداس نہ دیکھ سکتی تھیں۔ میں تو انکی دعاؤں کا محور تھا خواہ ساری عمر بیکار رہتا کسی کو طعنہ دینے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی... ان کی موجودگی میں کبھی کسی نے جھڑکا تک نہ تھا.... اور اب.... میں سب کیلئے بوجھ بن گیا ہوں... اور راحینہ کو مجھ سے زبردستی چھین لیا گیا ہے.... امی!.... مجھے اپنے دامن میں چھپا لو۔ زندگی کی ویرانیاں اب ناقابل برداشت بن گئی ہیں۔... کسی کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور اسکے قدم رک گئے۔ اسنے نظریں گھمائیں۔ اسکا ایک کلاس فیلو شفیق شیر فروش پہلوان عاشق کا بیٹا۔ اپنے باپ کی گدی پر بیٹھا اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہا تھا.... جب سے شفیق نے اپنے باپ کی دکان پر بیٹھنا شروع کیا تھا۔ منصور کی نظروں میں اسکی کوئی وقعت نہ رہی تھی۔ وہ کترا کر نکل جایا کرتا تھا۔

بہت سے شعر لفظوں میں نہیں ڈھلتے۔ انہیں آدمی اپنے اندر کہتا سنتا اور سر دھنتا ہے....

اسکے نزدیک شفیق کا یہ فعل معیوب تھا۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان سے اسے ایسے گھٹیا کردار کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ ... اس نے سوچا کہ مرنے سے پہلے اس سے بھی دو باتیں کرنے میں کیا حرج ہے۔ کم از کم اسے اتنا یاد تو رہیگا کہ موت سے پہلے اس نے پرانے رشتوں کو پھر سے استوار کر لیا تھا۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچ گیا.. شفیق نے قریب کھڑے ہوئے ایک لڑکے کے پیالہ میں دہی ڈالا اور مسکرا کر اس سے مخاطب ہوا — "یار عجیب آدمی ہو چکے سے پاس سے گذر جاتے ہو.... ہم سے کیا قصور ہو گیا ہے.." اس کا جی چاہا کہ کہدے ..؟ اس سے بڑا قصور کیا ہو سکتا ہے کہ باپ کی گدی پر بیٹھ کر تم نے تعلیم کو بدنام کیا ہے۔ یہ بھی کوئی کام ہے زبردستی مسکرا کر گاہکوں کی خوشنودی حاصل کیجائے۔ اگر یہی کام کرنا تھا۔ تو تعلیم کیوں حاصل کی تھی! —" مگر وہ خاموش ہی رہا، اس سے وہ الجھنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے دہی مرتبان میں ڈالکر مدھانی کے دستہ کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیکر کہا۔ "چائے پی پی کر تم نے تو انتڑیاں تک جلا ڈالی ہیں۔ لسی کا ٹھنڈا میٹھا دور چل جائے تو کیا حرج ہے"؛ اس کے اندر سے ایک آواز ابھری — "اسکا دل نہیں توڑنا چاہیئے موت سے پہلے لسی پینے میں کیا حرج ہے"۔ مدھانی ہتھیلیوں کی رگڑ سے پیتل کے قلعی شدہ مرتبان میں چکر کھا رہی تھی۔ اور منصور اسکی طرف دیکھتے ہوئے زندگی کو موت کے بھنور میں غوطے دے رہا تھا۔ فل سائز کے گلاس میں لسی ڈال کر شفیق نے مخلصانہ مسکراہٹ کے ساتھ گلاس اسے پکڑا دیا۔

گلاس کی بیرونی سطح پر جمی ہوئی ٹھنڈک اس کی پوروں کے اندر سرایت کر کے سینے کے اندر دور تک بھیل گئی۔ گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ تو عجیب سی لذت محسوس ہونے لگی۔ گھونٹ گھونٹ لسی پیتے ہوئے اس کے اندر حسرتوں کی بکھری ہوئی لاشوں میں حرکت پیدا ہونے لگی۔ خالی گلاس چبوترے پر رکھ کر اس نے گہرا سانس بھرا۔ اور یکدم امینہ کا خیال آنے پر اس کے اندر سرور کی جو لہریں مچلنے لگیں تھیں وہ المناک ٹیسیں بن گیئں۔ اور آنکھوں میں دھندلکے پھیلنے لگے۔ ہتھلیوں سے آنکھیں مل کر وہ دوکان سے پیچھے ہٹ گیا۔ شفیق نے داد طلب نظریں جا کر پوچھا —"کیوں یار — مزہ آیا؟ —" ہونہہ — وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سوچا "مزہ کیسا؟ اسکی دلجوئی کی خاطر لسی پی ہے — ورنہ — میں کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ البتہ بھوک کا احساس مٹ گیا ہے۔ اب فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی — خودکشی کیلیئے کونسا طریقہ استعمال کرنا چاہیئے؟" آگے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے کئی خاکے بنائے — کئی منظر آنکھوں میں ابھر آئے... مگر اسکی تسلی نہ ہوئی" کوئی بات نہیں — ابھی سارا دن پڑا ہے کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئیگا.... موت سے پہلے ہر منظر پر الوداعی نظر ڈالنے میں کیا حرج ہے۔ پھر یہ زندگی کے ہنگامے کہاں!

زندگی کا ہر دکھ لالچ اور حرص کی پیداوار ہے

..... دائیں بائیں نظریں گھماتے وہ اپنے اندر جو خلا محسوس کر رہا تھا۔ اس میں حسین رنگوں کی بارش ہونے لگی۔ "مجھے مرنا تو ہے ہی اس کائنات سے سارے ناطے توڑ کر موت کی وادی میں داخل ہونے کیلئے اب دیر نہیں کرنی چاہیئے۔" اسکی رفتار تیز ہو گئی۔ "ارے عزیز ذرا ٹھہرنا۔" وہ آواز کے سحر سے رک گیا۔ کتنا دہ سڑک کے فٹ پاتھ کے قریب ایک کار کو دو آدمی دھکا لگا رہے تھے۔ اسٹیرنگ ایک نازک اندام حسینہ نے تھام رکھا تھا۔ "کیا بات ہے مجھے کس نے آواز دی ہے؟" اس کی نظریں حسینہ پر مرکوز ہو گئیں۔ ایک آدمی نے کمر سیدھی کر کے آستین سے پیشانی پر پسینہ کے قطرات صاف کئے اور اس سے مخاطب ہوا۔ "مسٹر دھکا لگانے میں ہماری مدد کریں مہربانی ہو گی۔" اس نے سوچا "اگر کار اسٹارٹ ہو گئی۔ تو ان لبوں پر مچلتی ہوئی مسکراہٹ میں سے اسے بھی اپنا حصہ مل جائیگا۔ اس طرح یہ حسرت بھی پوری ہو جائیگی۔ کہ کسی حسینہ نے موت سے پہلے اسے کسی قابل تو سمجھا ہے۔ وہ بھی دھکا لگانے والوں میں شامل ہو گیا۔ کار واقعی اسٹارٹ ہو گئی۔ اور حسینہ کی شہد آگیں مسکراہٹ سے اس کے اندر حسرتوں کے مدفن پر بکھری ہوئی ادھموئی تتلیاں رقص میں آگئیں۔ "چلو ایک اور تحفہ سہی۔ پرخلوص جذبوں۔ اور احسان مندانہ مسکراہٹوں کا تحفہ۔ اب مرنے میں کچھ آسانی پیدا ہو گئی ہے۔" اس کے قدم غیر شعوری طور پر اسٹیشن کی طرف اٹھنے لگے۔ اسٹیشن کے اندر اور باہر بڑی گھما گھمی تھی۔

مسافر خانہ میں بہت سے خوانچہ فروش مسافروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی خاطر مختلف آوازیں لگا رہے تھے۔ بنچوں پر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ نل کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ "گاڑی نجانے کب آئے گی۔ اور پھر پلیٹ فارم پر گاڑی رکنے سے پہلے اگر خود کو انجن کے سامنے گرا دیا جائے۔ تو ہو سکتا ہے ٹانگیں یا بازو کٹ جائیں۔ لیکن یہ سودا مہنگا پڑے گا۔ نہ جانے اپاہج ہو کر زندگی اتنا بڑا بوجھ اٹھا سکے!" لوکل ٹرین کی گڑ گڑاہٹ نے اسے چونکا سا دیا۔ مسافر باہر نکل رہے تھے۔ وہ پھاٹک کے قریب آکر رک گیا۔ مسافروں پر نظریں گھماتے ہوئے اسے یوں دکھائی دیا جیسے ایک جانا پہچانا چہرہ پاس سے گذر گیا ہو۔ "خواتین کی قطار ختم ہو گئی تو وہ بے دلی سے سڑک پر آگیا۔ کسی نے اسے آواز دی "اے بیٹا ذرا رکنا۔" اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر خوش پوش آدمی اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ اس کے اور قریب ہو گیا۔ "فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" اس آدمی نے مسکرا کر کہا۔ "میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ احمد پورہ تک جانا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ تانگہ والا کہیں ایسے ہی گھماتا نہ پھرے۔" ..... "یہ محلہ زیادہ دور تو نہیں میرے ساتھ آئیے۔" اس نے اجنبی کا اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ آگے قدم اٹھاتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ "تم خوامخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔ تمہیں اب دوسرے لوگوں سے کیا واسطہ۔ اپنے مقصد کے حصول کیلئے تمہیں زیادہ دیر نہیں لگانی چاہیئے۔ مگر۔

اپنی زبان کی خوبیاں وہی سمجھ سکتا ہے جو اپنی زبان کو دنیا بھر کی زبانوں سے اچھا سمجھتا

— کیا کروں۔ یہ اجنبی کیا یاد کرے گا۔ یا اہلِ شہر کے متعلق غلط نظریات قائم کرے گا۔ چند منٹ اگر ایک اچھے مقصد پر صرف ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔ اجنبی کے بتائے پتہ پر اسے پہنچا کر اس نے الوداعی مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ تو اجنبی نے جیب میں سے پانچ کا نوٹ نکالکر مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تھما دیا "کیا! میں کسی معاوضہ کی غرض سے آپکو یہاں تک نہیں لایا"۔ "میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔ تمہارے کردار نے بے حد متاثر کیا ہے۔ یہ معاوضہ نہیں ہدیہ ہے ۔ قبول کرلو!" وہ گم سم کھڑا رہا۔ پانچ کا نوٹ اسکی مٹھی میں چرمرا گیا تھا گہرا سانس بھر کر وہ بے نام منزل کی طرف قدم اٹھانے لگا کچھ دور ایک ریڑھی کے گرد کئی لوگ جمع تھے اس نے ریڑھی والے کو بڑے غور سے دیکھا وہ بڑی پھرتی سے گاہکوں کیلئے چاٹ بنا رہا تھا اس کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اس کے پاس اب پانچ روپئے تھے۔ یہ روپے اب میرے لئے بیکار ہیں۔ انھیں خرچ کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ فل پلیٹ کا آرڈر دیکر وہ ایک طرف ہو گیا۔ اس کی باری آخر میں آئی۔ چاٹ بے حد مزیدار تھی (چند منٹ تک تو وہ واقعی فراموش کر بیٹھا کہ کس مقصد کے خاطر وہ گھر سے نکلا تھا۔ ایک تانگہ پاس سے گذرا جس کے دائیں بائیں سینما کے بورڈ بندھے ہوئے تھے اس نے فلم کا نام دل میں کئی بار دہرایا۔ اور خالی پلیٹ ریڑھی کی ایک طرف رکھ کر وہ خجالت سی محسوس کرنے لگا۔ یہ فضول کاموں میں وقت گذارنے سے زندگی کا درد جان لیوا بن جائیگا۔ زندگی کے بوجھ کو ناقابلِ برداشت بننے سے پہلے اتار پھینکنا چاہئیے "۔ چاٹ والے سے تین روپئے واپس لے کر وہ بدحواس سا فٹ پاتھ پر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ سورج سر پر آگیا تھا۔ ایک ابھرے ہوئے پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ تڑپ اٹھا انگوٹھا زخمی ہوگیا تھا۔ درد سے بیتاب ہو کر وہ وہیں بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں گدلا پانی تیرنے لگا تھا۔ اس نے سر گھٹنوں میں دبالیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی انگوٹھے پر نشتر زنی کر رہا ہو۔ اس پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر کر وہ زخمی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ کتنی ہی دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا تھا۔ ایک ٹرک کو سامنے کی سمت سے آتے دیکھ کر وہ ایکدم اٹھ کھڑا ہوا اور جب ٹرک دندناتا ہوا قریب سے گذر گیا۔ تو اس نے گہرا ٹوٹا ہوا سانس بھرا۔" اچھا ہی ہوا کہ خود کو ٹرک کے آگے نہیں گرایا۔ اس طرح موت کا دامن نہ پکڑا جا سکتا تو کتنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا موت ایسی ہونی چاہئیے کہ سانس کی ڈوری ٹوٹنے کا پتہ ہی نہ چل سکے۔"

"تو پھر کونسا طریقہ اپنانا چاہیئے"۔ ذہن پر زور ڈال کر وہ سوچ کے دائروں کو سمیٹنے لگا۔ کوئی آسان راستہ نظر نہ آرہا تھا۔" وہ آگے کی طرف ہولے ہولے قدم اٹھانے لگا۔ چند گز کے فاصلہ پر مراد سینما ہاؤس تھا۔ وہ اسکی بیرونی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا ابھی بڑا پھاٹک بند تھا۔ سینما کی پیشانی پر قد آدم بورڈ لٹک رہے تھے۔ جذباتی مناظر کی تصاویر پر نظریں گھماتے ہوئے

اگر کوئی تمہاری برائی کرے تو تم یوں زندگی بسر کرو کہ لوگ اس کا اعتبار ہی نہ کریں ——— (افلاطون)

اسے امینہ کا خیال آگیا۔ رقص کرتی ہوئی نیم برہنہ لباس میں ہیروئن پر اسے امینہ کا گمان ہونے لگا۔ "وہ بھی ایک ایکٹریس ہے، کس صفائی سے اپنی باتوں کے ذریعے سارے بندھن توڑ دیئے ہیں۔ میں اسے کن بلندیوں پر لے جانا چاہتا تھا۔ اور اس نے خود کو پاتال میں گرا دیا ہے۔ نقصان بھی اسی کو اٹھانا پڑیگا۔ مجھ جیسا پیار کرنے والا اسے ساری زندگی میں نہیں مل سکتا۔ جب پچھتاووں کے ناگ پھنکارنے لگیں گے تو پھر نجات کی ساری راہیں بند ہو چکی ہوں گی اور آخری بار اسکا دیدار کر لینے میں کیا حرج ہے۔ کم از کم اسے اتنا علم تو ہوگا کہ راہِ وفا میں جان دینے والے کتنے با حوصلہ ہوتے ہیں ــــ ہونہہ۔ کیسی احمقوں والی باتیں سوچ رہے ہو۔ مرنے والے یوں بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہاں جانے کی کیا تک ہے۔ اسے تمہاری موت کا جب علم ہوگا۔ تو نہ جانے اسکا ردعمل کیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی سہیلی سے کہہ دے "خس کم جہاں پاک" وہ دیواروں پر لگے ہوئے نئی فلموں کے اشتہار پڑھنے لگا۔ اسکی نظریں پھر ہیروئن کے سراپے پر پھسلنے لگیں۔ "اگر مجھے فلم ہی میں کوئی چانس مل جاتا تو آج مجھے یہاں دیکھ کر لوگ پروانوں کی مانند طواف کرنے لگتے۔ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ اور اگر مجھے گیٹ کیپر کی ملازمت کی پیشکش کی جاتی تو میں اسے حقارت سے ٹھکرا دیتا۔ میرا معیار اس سے بہت بلند ہے۔" کار کی بریکیں زور سے چیخی ہیں۔ اور وہ خوف زدہ انداز میں سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ چکیلی کار نے ایک نوجوان کو دھکا دیکر فٹ پاتھ کے قریب پھینک دیا تھا۔ اور ڈرائیور کار لیکر بھاگ گیا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر قدم اٹھاتا زخمی نوجوان کے قریب پہنچ گیا۔ لباس خون میں لت پت تھا۔ اور اس پر بے ہوشی طاری تھی۔ "اسے فوری طور پر ہسپتال پہنچانا چاہیئے۔" اس کے پرسوز لہجہ نے کسی کو متاثر نہ کیا۔ ایک تانگہ کو روک کر اسنے پھر التجا کی۔ "کم از کم اسے تانگہ میں تو لٹا دیں میں اسے ہسپتال پہنچا دونگا۔ آپ اتنی مدد تو کریں۔" کئی لوگ کھسک گئے تھے چند آدمیوں نے زخمی کو اٹھا کر تانگہ میں ڈال دیا۔ اس نے کوچوان سے منت کی۔ "بھائی خدا کے لئے ذرا جلدی کرو۔ کہیں سارا خون بہہ جانے سے اسے موت نہ دبوچ لے۔" منصور اس کے پاس ہی تانگہ میں بیٹھ گیا۔ کوچوان نے گھوڑے کو دوڑا دیا تھا۔ ہسپتال میں وہ یوں سانس لے رہا تھا۔ جیسے زندگی زہرخند کے ساتھ مسکرا رہی ہو۔ زخمی نوجوان کے لواحقین کو خبر ملی۔ تو وہ بھی سراسیمگی کی حالت میں ہسپتال میں جمع ہو گئے۔ زخمی کو ابتدائی طبی امداد کے بعد اسٹریچر پر ڈال کر وارڈ میں لے جایا گیا۔ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہسپتال کے عملہ کے رویہ کے خلاف احتجاجی چہ میگوئیاں پھیلنے لگیں تھیں منصور یوں درد محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود زخمی ہو گیا ہو۔ خودکشی کے فیصلے کی گونج اسکے اندر مدھم پڑ گئی تھی۔ وہ اس زخمی کے جلد ہوش میں

زندگی کے پھل سے اتنا پیار نہ کرو کہ اس سے غموں کا رس چھلکنے لگے۔

آنے کی دعا مانگ رہا تھا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع ملی۔ کہ معاملہ سیاسی نوعیت اختیار کرنے لگا تھا۔ اس نے سرجن کو بلا لیا باہم مشورہ سے زخمی کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ منصور برآمدے میں یوں ٹہل رہا تھا جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی قیمتی چیز کی تلاش میں ہو۔ سورج مغرب کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ منصور کو وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ زخمی کو دوبارہ وارڈ میں لے جایا گیا۔ اور سرجن نے مجمع کی تشفی کی خاطر مطلع کیا کہ زخمی کی حالت بہت بہتر ہے۔ وہ ہوش میں آ گیا ہے فکر کی بات نہیں۔ دو چار دن میں صحت یاب ہو کر گھر چلا جائیگا۔ منصور نے گہرا اطمینان بخش سانس لیا۔ اور اسکے ساتھ ہی اسے اپنی ذات کی بے مائگی کا احساس ہو گیا۔ "زخمی تو بچ گیا ہے اسکا زندہ رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ گھر والوں کیلئے اسکا وجود بے حد اہم ہے۔ مگر میں کس سہارے پر زندہ رہ سکتا ہوں! میری ذات تو کسی کے لئے بھی وجہ مسرت نہیں ہے۔ میں تو سب کی نظر میں ایک ناکارہ پرزہ ہوں۔ جسے اگر گندی نالی میں بھی پھینک دیا جائے تو کمی نہیں محسوس ہوتی۔ جب شام کے سائے گہرے ہوں گے۔ تو میرے بدن کے ٹکڑے ریلوے لائن پر دور تک بکھریں گے۔ کسی آنکھ سے بھی آنسو نہ ٹپکے گا۔"!

ہسپتال کے احاطہ سے باہر نکلا تو سورج کی زرد بیمار شعاعیں۔ یوکلپٹس کی ٹہنیوں میں الجھی دم توڑ رہی تھیں۔ سڑک کے دوسری طرف لکڑی کے کھوکے میں سے اونچی آواز میں کسی نے اسے پکارا۔ "منصور ــــ یار ــ کہاں سے آئے ہو؟" اس کے قدم رک گئے۔ گردن گھما کر دیکھا۔ انور ہاتھ کے اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔ منصور نے اسے پہچان لیا۔ وہ اسکا بچپن کا دوست تھا۔ مڈل کے امتحان میں فیل ہو کر وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اور اپنے باپ کے ساتھ کام پر جانے لگا۔ جب کبھی ملاقات ہوتی۔ منصور اسکے مقدر پہ افسوس کرنے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ انور اسے ہر بار یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ حالات کی مجبوری نے اسے اگرچہ تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ مگر اس نے وقت کو ضائع تو نہیں کیا ہاتھ میں اگر کوئی ہنر ہو تو آدمی بھوکا نہیں مر سکتا۔ ہوائی قلعے تعمیر کرنے سے تو بہتر ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے بغیر عزت کی روٹی میسر ہو جائے۔ منصور کو اس کی باتیں ذرا بھی متاثر نہ کرتی تھیں۔ اس کے نظریہ کے مطابق۔ تو زندگی کی آسائشیں افسر بننے ہی سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ سراب کے تعاقب میں وہ اتنی دور نکل گیا تھا۔ کہ اب ریت کے سمندر میں اسے اپنے سائے سے بھی خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اور مادی خواہشات کی تکمیل کے بغیر وہ زندگی کو ایک اذیت ناک بوجھ سمجھ رہا تھا۔!

انور کو چند منٹ غور سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سوچا۔ اسکی بات بھی سن لینی چاہیئے۔ میری موت کی خبر سن کر

تنقیدی ذہن تعمیری کاموں میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

کہیں اس کے دل میں حسرتوں کی کرچیاں نہ بکھر جائیں۔ "یہ بھی کیا یاد کریگا" اس کے قریب آکر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اور اداسیاں اس کے چہرے پر گہری ہوگئیں۔

انور نے گدی پر اکڑوں بیٹھکر پوچھا "کہاں سے آرہے ہو۔! آج کل کیا کر رہے ہو؟ خوابوں کی پرستاری کا کیا حال ہے؟" منصور نے اس کے سوال کو نظرانداز کر کے پوچھا۔ "یہ کھوکھا کب سے بنوایا ہے؟ تم تو کارخانہ میں کام کرتے تھے۔! کیا وہاں سے چھٹی مل گئی ہے؟" "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ کھوکھا میرے ایک رشتہ دار نے بنوایا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ اپنی فیملیس لیکر کراچی چلا گیا۔ وہاں دودھ کے کاروبار میں آمدنی وافر ہے۔ جس وقت میں نے کھوکھا خریدا تھا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ کہ آمدنی کتنی ہے اور اس کاروبار کی روایات کیا ہیں۔۔۔ کارخانہ سے چھٹی لیکر خدا کا نام لیا اور کام شروع کیا۔۔۔ محنت مزدوری میں مسلمان کو عار محسوس نہیں کرنی چاہیئے۔ جائز کمائی کے ذرائع تلاش کرنا ہر آدمی کا فرض ہے۔۔۔ ایک ہفتہ بعد ہی میں نے اندازہ لگالیا۔ کارخانہ کی ایک ماہ کی تنخواہ۔ ایک ہفتہ کی چائے کی آمدنی سے بھی کم ہے۔ گاہک سے جس حسن سلوک سے پیش آتا تھا۔ اس نے میرے کاروبار کو ہر طرف سے متعارف کرادیا۔ اور دو ماہ بعد گھر کی حالت پہلے سے زیادہ سدھر گئی تھی۔ چار پیسے بنک میں بھی جمع کرانے کے قابل ہو گیا تھا۔ باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر آکر اطمنان سے بیٹھو۔" اس کے پاؤں زمین پہ جم کر رہ گئے تھے۔ "اب اسے کیسے بتاؤں کہ یار اندر آکر بیٹھ گیا۔ تو موت روٹھ جائیگی! اسے ملنا مشکل ہو جائیگا کوئی کام کی بات کرو۔" انور نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسکا بازو پکڑ لیا۔ "بغیر چائے پلائے نہیں جانے دونگا۔ جب سے یہ کھوکھا لیا ہے پہلی بار تم سے ملاقات ہوئی ہے۔" منصور کسمسایا لیکن کوئی پیش نہ چلی۔ بادل ناخواستہ اسے اندر آنا پڑا اسٹول پہ بیٹھکر اس نے باہر جھانکا۔ ماحول ملگجی ہو گیا تھا۔ شام کی آمد سے ہر چیز سنولانے لگی تھی۔۔۔ انور نے سٹو جلانے سے پہلے بجلی کا بٹن دبایا۔ اور بلب تیز چمک دکھا کر فیوز ہوگیا۔ "ہت تیرے کی۔ اسوقت ہی فیوز ہونا تھا۔" پھر وہ منصور سے مخاطب ہوا۔ "تم ذرا گدی پر آکر بیٹھ جاؤ میں چوک سے بلب لیکر آتا ہوں۔ روشنی کے بغیر دکانداری نہیں چل سکتی۔" انور کے جانے کے بعد منصور بے دلی سے اٹھا۔ جائی ٹلی۔ اور گدی پر آکر بیٹھ گیا۔ ویران نظروں سے وہ سڑک پر پھیلتی ہوئی سانولی شام کو دیکھ رہا تھا۔

"بھائی جان! سلام۔" وہ یکدم چونک پڑا۔ دل کی دھڑکن میں اضافہ ہوگیا کھوکھے کے دائیں طرف

اندھیروں کو کوسنے سے اندھیرے دور نہیں ہوتے بلکہ اور بڑھ جاتے ہیں خوبی یہ ہے کہ ان اندھیروں میں ایک شمع روشن کر دیں

امینہ اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کے ساتھ کھڑی تھی - نعیمہ کے سلام کا . . . جواب اس نے غیر شعوری طور پر ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاکر دیا اور امینہ پر نظر ڈالکر اسکی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے امینہ نے نقاب اٹھالیا تھا - اور یوں اسکی طرف دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو . . . اس نے مسرورانہ لہجہ میں پوچھا - " یہ ! یہ کھو کھا آپکا ہے ؟ "

منصور کو جواب کیلئے الفاظ نہ مل رہے تھے - نعیمہ نے شرارتاً پوچھا کہ - " کیا ہمیں بھی چائے پلائینگے - ! " منصور گھٹ کر رہ گیا - یونہی اس نے بھی پوچھ لیا اور کہا یہاں پر میری موجودگی آپکو اچھی لگی ہے - ؟ کیا آپ اس کاروبار کو پسند کرتی ہیں ؟ " امینہ کا جواب سننے کی خاطر اس نے سانس روک لیا تھا - " کیوں نہیں " امینہ نے پر اعتماد لہجہ میں کہا " میں تو اس انوکھے روپ میں آپکو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی ہوں - میں تو ہر اس کاروبار کو پسند کرتی ہوں جس میں عزت کی روٹی میسر ہو " ، " سچ " وفور مسرت سے اسکی پلکیں بھیگ گئیں - " یہ میں کیا سن رہا ہوں - میں تو اسے شہزادی بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے آج مجھے اپنی زمین کی خوشبو سے سرشار کر دیا ہے - یہ - یہ عقدہ بھی عجیب ہے " اس نے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا " اندر آکر آرام سے بیٹھ جاؤ - میں چائے تیار کرتا ہوں " امینہ نے نعیمہ کا بازو پکڑ کہا - " چائے پھر پئیں گے پہلے تو میں اباجان کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہوں کہ آپ نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے - اب بڑی آپا کی مخالفت کا خطرہ ٹل گیا ہے - میں تو اپنی ہمسائی کی عیادت کیلئے آئی تھی - کیا معلوم تھا کہ آپ نے روپ میں مل جائینگے - " انھیں جاتے دیکھ کر منصور کو ہر چیز دلکش نظر آنے لگی - سانولی شام میں امینہ نے جو خوشبو رچادی تھی وہ اسکی روح کی گہرائیوں میں پھیلتی جارہی تھی -

نعتِ محمدؐ

★ سوزؔ لسیری (سردل)

محمدؐ پیشوائے اوّلیں و آخریں تم ہو
نبوت ختم ہے جن پر وہ ختم المرسلیں تم ہو

بنائے حق تعالیٰ نے دو عالم آپؐ کی خاطر
رموزِ کن فکاں کی بزم کے مسند نشیں تم ہو

ہوا ہے جس کے حسنِ روئے زیبا سے جہاں روشن
وہی روشن جبیں تم ہو وہی ماہِ مبیں تم ہو

تمہارے پرتوِ ادنیٰ سے عالم جگمگاتا ہے
وہ خورشیدِ یقیں تم ہو وہ سرتاپا حسیں تم ہو

سکھائے تم نے جینے کے قرینے ایک عالم کو
قیامت کی جو پوچھو تو شفیع المذنبیں تم ہو

شبِ معراج شوقِ دید میں خلاق اکبر نے
بلایا عرش پر جن کو وہ سلطانِ زمیں تم ہو

ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر کا یہ رتبہ ہے
یہ چاروں باب ہیں اور بانیٔ دینِ متیں تم ہو

تمہارے سوزؔ کا آقا! یہ ایماں ہے عقیدہ ہے
سراپا ابرِ رحمت، رحمت اللعالمیں تم ہو

شعری انعامی مقابلہ نمبر ۱

یادیں میٹھی بھی ہوتی ہیں اور کڑوی کسیلی بھی
یادیں رُلاتی بھی ہیں اور تڑپاتی بھی — اور
یادیں زندگی کا سرمایہ بھی ہوتی ہیں
زندگی کے سارے سہارے چھوٹ جاتے ہیں
لیکن یادیں آدمی کا ساتھ نہیں چھوڑتیں
آپ کے پاس بھی کچھ یادیں ہونگیں۔
آپ "یاد" پر کوئی اچھا سا شعر لکھ کر روانہ
فرمائیں۔ وہ شعر آپ ہی کا کہا ہوا ہو — یہ
ضروری نہیں۔ شعر کے نیچے شاعر کا نام ضرور
تحریر کریں۔ ایک لفافہ یا پوسٹ کارڈ پر
صرف ایک ہی شعر لکھیں۔
سب سے اچھے شعر پر ۱۵ روپئے اور
دوسرے نمبر پر آنے والے شعر پر ۱۰ روپئے
انعام دئے جائینگے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۵ء تک
آپ کے اشعار ہمیں مل جانے چاہئے۔
اشعار اس پتہ پر روانہ فرمائیں

شعری انعامی مقابلہ
ماہنامہ پیکرِ خوشبو
30/159 - چنار اسٹریٹ
کرنول
518001

لوگوں کے سامنے اپنی تکالیف بیان کرنے سے پہلے
ایک بات سوچ لو۔ ان میں آدھے ایسے ہیں جنہیں
تمہارے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں اور باقی آدھے
تمہاری تکالیف سن کر خوش ہوتے ہیں

بلا عنوان

یونس انجم

یہ کہانی بغیر کسی عنوان کے شائع کی جا رہی ہے۔ آپ اس کا کیا مناسب عنوان تجویز کرتے ہیں؟ ایک یا زیادہ سے زیادہ پانچ عناوین پوسٹ کارڈ پر لکھ کر روانہ فرمائیں۔ اوّل اور دوم آنے والے دو عناوین پر ۱۵ر اور ۱۰ر روپئے بالترتیب انعام دئے جائیں گے۔ عناوین ۱۰ر دسمبر تک ہمیں موصول ہو جانے چاہئے۔ پتہ درج ذیل ہے۔

بلا عنوان معرفت ۳۰/۱۰۹ ماہنامہ پیکر خوشبو
چنار اسٹریٹ کرنول

وہ اپنی اپنی گلی کوچوں بازاروں کا ایک اٹوٹ حصہ ہی تو تھا...... بچپن کی رنگ رلیاں، جوانی کے پرکیف فواروں کی طرح آزاد فضا میں ڈولتے آسمان کو چھولینے، ستاروں سے آگے چاندنی راتوں میں چاند کے آئینے میں کسی ان دیکھی خوابوں کی پریوں جیسی شبیہہ دیکھنے کی تمنا والے وہ دن بھی اپنی گلی کوچوں کی چھتوں پر کھلتے گلابوں کی طرح تھے۔ لیکن ...... اب وہ ایک اجنبی کی طرح سہما سہما سا ان کوچوں گلیوں اور بازاروں سے گذر رہا تھا۔ جیسے اس کا ان سب سے کبھی کوئی رشتہ نہ رہا ہو...... وہ چلتا رہا۔ چلتے چلتے وہ اس مقام پر آ گیا جہاں سے دل بٹ جاتے ہیں اور انسانوں کی تقسیم شروع ہو جاتی ہے...... اس نے لمحہ بھر کو رک کر سوچا کہ کیوں نہ میں بھی خود کو تقسیم کرلوں۔ کیا ہوا اگر آج میرے وطن کی سرزمین مجھ پر تنگ ہو گئی ہے لیکن خدا کی زمین تو بہت بڑی ہے۔ کہیں کوئی ٹھکانہ تو مل ہی جائے گا۔ وہ آگے بڑھا لیکن اسے دھکیل دیا گیا۔ اور پستولوں کا نشانہ بنائے اس سے کہا گیا کہ تم ہمارے وطن کے بیٹے نہیں ہو۔ اس لئے تمہیں یہاں رہنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔ جب خوبصورتی کا کوئی روپ نہیں خوشبو کا کوئی بدن نہیں پیار کی کوئی منزل نہیں، آرزو کی کوئی سرحد نہیں۔ جہاں چاند اپنی پوری فیاضی کے ساتھ چاندنی بکھیر رہا ہو۔ جھرنے اپنی پوری دریا دلی کے ساتھ رواں دواں ہوں، وہاں لوگ دل کے اتنے کٹھور کیوں ہیں کہ انہیں انسانی آہٹیں بھی گوارا نہیں۔ انسانوں کی اس تقسیم کا ادھیکار انہیں کس نے دے دیا۔ اس کے چھوٹے سے ذہن نے بڑی بات سوچی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ تقسیم ہونے والے سارے راستوں تک گیا۔ اسے ہر جگہ دھتکار ہی ملی۔ وہ پھر اپنا بوجھل وجود اٹھائے چلنے لگا...... چلتا رہا۔ اس کے پاؤں میں پڑے ایک ایک چھالے ایک ایک کرکے پھوٹنے لگے۔ اس سے چلا نہ گیا۔ گرم ریت کے دہکتے ذرے پیر کے چھالوں میں پناہ مانگ رہے تھے...... تبھی اس کی نظر برسوں پرانے زنگ آلود ایک آہنی گیٹ پر پڑی...... سوا نیزے پر آتے سورج کی روشنی میں اس نے دو قدم اور آگے بڑھائے اور بڑبڑانے کے سے انداز میں بورڈ پر لکھا پڑھا...... "یہاں بلا امتیاز رنگ و نسل و بلا لحاظ مذہب و وطن تدفین کی عام اجازت ہے......"

وہ سر جھکائے خاموشی سے گیٹ کھولے اندر داخل ہو گیا...... اور...... آہنی گیٹ کی دلخراش کراہ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ہو گئی۔ OO

اب محافظ پر محافظ کا تقرر چاہئے ؎ جان کی پھر بھی اماں ہو یہ ضروری تو نہیں یوسف جمیل

سراب

محمد یوسف جمیل جامعی

یوں تو اس پہ ہر رنگ کھلتا تھا۔ مگر آج وہ سفید لباس میں کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ لباس کی مناسبت سے بالوں میں سفید گلاب، اور پیروں میں سفید کابوری جوتا گویا چودھویں رات کی چاندنی میں ڈھلا ایک حسین تاج محل معلوم ہو رہی تھی، اسکے وجود میں جیسے ساری بہاریں سمٹ کر آ گئی ہوں۔ جب وہ بولتی پھول جھڑتے۔ سرخ گلابی ہونٹوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے دانت انار کے سفید چمکدار دانوں سے کم نہ تھے۔ اسکی سبک خرامی پر بادِ صبا بھی شرمائے۔ اسکی نرگسی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی جو اسکی ذہانت کی عکاسی کر رہی تھی۔ سڈول جسم، نازک اندام، کھلتا ہوا رنگ جیسے قدرت نے اسکے وجود کو پھول کے پتیوں سے گوندھ کر بنایا ہو۔ اسکے شرمانے نظریں چرا کے دیکھنے کا انداز جان لیوا تھا۔ جب سے انٹر فرسٹ ائیر میں داخل ہوئی تھی۔ ایک قیامت آ گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی پاس سے گزرتی ہوئی بہار کو ہر کوئی دیکھنے پہ مجبور ہو جاتا۔ مگر اس نے اپنی شخصیت کا بھرم اسطرح قائم رکھا کہ کسی منچلے کی بھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ اسکی شان میں گستاخی کرے۔ جاوید کا انہیں دنوں اردو لکچرر کی حیثیت سے نیا نیا تقرر ہوا تھا۔ مگر بہت جلد اس نے اپنی قابلیت اور وسیع مطالعہ کی بنا پر اپنے اسٹوڈنٹ کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ رضیہ جب پہلی بار اسکی کلاس میں آئی تو ساتھ میں پرنسپل سرفراز بھی تھے۔ انہوں نے رضیہ کا تعارف کرایا تو جاوید رضیہ کے سحر زدہ حسن میں کھو سے گئے۔ پھر پرنسپل کی آواز نے جاوید کو چونکا دیا۔ "رضیہ یہ ہیں مسٹر جاوید جو تمہارے اردو کے لکچرر ہیں"۔ رضیہ نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ "آداب" کہا۔ جاوید تو اب دیکھتے ہی رہے۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ انھیں جواب دینا ہے۔ اردو لکچرر ہونے کی حیثیت سے جاوید کو شعر و ادب سے کافی لگاؤ تھا۔ وہ ایک اچھے قلمکار اور شاعر بھی تھے۔ مگر جب سے رضیہ کو انھوں نے دیکھا قلم کو ایک نئی تحریک ملی، خیالات میں جنبش ہوئی۔ اب وہ تخیلات کی حسین وادیوں میں اپنے محبوب کے پیکر کو ڈھونڈتے ان دنوں کی کہی ہوئی غزلوں میں بلا کی روانی اور رومانیت تھی۔ وہ اپنے لکچر کے دوران تشریحات کے ضمن میں اپنے اشعار پیش کرتے اب تک تو کسی نے اسکا نوٹس ہی نہ لیا تھا۔ کہ یہ اشعار خود جاوید صاحب کے ہیں یا کسی اور کے۔ رضیہ کو غالباً شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا جب بھی کوئی شعر جاوید صاحب گنگناتے۔ رضیہ پوچھ بیٹھتی سر ایک بار پھر وہ شعر پڑھ دیجئے اور پھر وہ اپنی بیاض میں نوٹ کر لیتی، ایک مرتبہ رضیہ نے پوچھ ہی لیا۔ سر اتنے خوبصورت اشعار کس نے لکھے ہیں۔ سب اب کلاس میں ہر طرف سے بھی اصرار بڑھا کہ ہاں سر! یہ اشعار کس کے ہیں۔؟ جاوید کو اب بتائے بغیر چارہ نہ تھا۔ اپنے اسٹوڈنٹس کو

ارمانوں کے الفاظ میں ڈھل جائے کوثر ‌ اس دور کے فنکار کا اسلوب کہاں ہے

(ڈاکٹر وحید کوثر)

نام ونمود صبح ومسا چاہتے ہیں لوگ   اس کام کے لئے بھی عصا چاہتے ہیں لوگ
سوز

خاموش کرتے ہوئے کہا اس احمق شاعر کو " جاوید کہتے ہیں۔ پھر کیا تھا کلاس روم تالیوں سے گونج اٹھی۔

اگلے روز کلاس روم کے دروازے پر رضیہ نے اپنی بیاض جاوید کے آگے کر دی جاوید نے جب بیاض دیکھی تو "غزل" لکھی تھی نیچے ایک مختصر سے نوٹ میں یہ لکھا ہوا تھا "سر! یہ میری پہلی کوشش ہے۔ دیکھیے میں اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہوں" جاوید غزل کے نوک و پلک درست کر دئے تو ایک اچھی غزل بن گئی۔ رضیہ کی اپنی غزل کی کامیابی پر جھوم جھوم گئی۔ اسکا سر افتخار سے بلند ہو گیا۔ وقفہ وقفہ سے وہ باقاعدہ جاوید سے اصلاح لینے لگی۔ روز بروز اس کا فن نکھرتا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ جاوید سے قربت اور بے تکلفی بھی بڑھ رہی تھی۔ رضیہ کے غزلوں میں پہلے جو معصومیت پائی جاتی تھی۔ وہ قدرے بدل رہی تھی۔ اک بانکپن، شوخی و شرارت اسکے غزلوں میں کار فرما ہوتی۔ دوست کی دوری اسکی بے رخی کا تذکرہ بھی خوبصورت انداز میں ہوتا یہاں پہنچکر جاوید کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی کوئی اندر سے کہتا جسکی بے رخی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ وہ تم ہی ہو۔ اب کی بار جاوید کے ملنے میں کچھ احتیاط اور کسی قدر تکلف تھا۔ مگر رضیہ جوں کی توں تھی۔ جاوید نے اپنے طور پر یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ رضیہ ہی اسکی شریک زندگی ہو سکتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قدرے وہ تکلف برتنے پر مجبور تھے۔ یوں بھی جاوید اپنے اندر اظہار کی قدرت نہ پا رہے تھے۔ جب بھی اظہار کا ارادہ کیا یہ سوچ کر خاموش ہو رہے کہ کہیں یہ رشتہ نشان ملامت نہ بنجائے۔

پھر اچانک رضیہ کا کالج آنا بند ہوا، جاوید تو جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ اسکے لکچر بے جان ہو گئے تھے۔ وہ اکثر بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ بار ہا ایسا بھی ہوا کہ لکچر دیتے دیتے اس نے کتاب بند کر دی اور عذر کر دیا۔ آج تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ اس عرصہ میں جاوید نے اسکی سہیلیوں سے بھی دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں کچھ کا کچھ مطلب نکال نہ لیں کیونکہ رضیہ کی دوستی کے ہلکے ہلکے چرچے بھی ہونے لگے تھے۔ وہ ان دنوں ایسے حالات سے گذر رہا تھا جو نہ کہے جا سکتے تھے اور نہ ہی سہے جا سکتے تھے۔

وہ آج بھی اسٹاف روم میں اکیلا آنکھیں موند کر بیٹھا ہے۔ کالج بہت دیر پہلے ہی چھوٹ گیا ہے۔ تمام اسٹاف جا چکا ہے صرف اکادکا ملازم کمروں کو تالے لگانے میں مصروف ہیں۔ "مے آئی کمنگ سر!" نسوانی آواز نے جاوید کو چونکا دیا۔ یہ رفیعہ تھی رضیہ کی کلاس فیلو! ارے رفیعہ تم۔ ؟ تم گئی نہیں۔ ؟ ؟

"سر! گئی تو تھی"

"رضیہ نے آپکے نام یہ لفافہ دیا ہے!!"

جرأت تو دیکھئے کہ شفاعت کے نام پر   محشر میں معصیت کا صلا چاہتے ہیں لوگ
مرزا فائق

جو شخص چاہتا نہیں اردو زباں کی خیر افسوس ہے کہ اس کی بقا چاہتے ہیں لوگ

بشیر احمد بشیر

"رضیہ نے ؟؟" "ہاں رضیہ نے !!"

جاوید کو رضیہ کا خط کیا ملا کہ کائنات مل گئی۔ اسکی بے قراری کو قرار آنے لگا۔ نہایت بے صبری سے اس نے لفافہ کھولا رضیہ کی تحریر یہ تھی۔

سر! میرے اچانک غیر حاضری پر آپ پریشان تو ضرور ہوئے ہونگے۔ مگر سر! میں مجبور تھی اپنے دوست کو بتا بھی نہ سکی۔ خیر دیر سے سہی آپکو یہ خوشخبری سنا دوں میرا رشتہ کسی تجمل نامی شخص سے طے ہوگیا ہے۔ جو سرکاری تعلیمات میں اعلیٰ افسر ہے۔ شاید اس رشتہ کی بات بہت پہلے سے چل رہی تھی۔ اور شاید ابا حضور نے مجھے مصروف رکھنے کیلئے انٹر میں داخل کرا دیا تھا۔ سر! مجھے امید نہیں تھی آپکا ساتھ اتنا جلد چھوٹے گا۔ آپکی شفقتیں عنایتیں کرم فرمائیاں بھلائے نہیں بھولیگی۔ اچھا دوست سارے جہاں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ میری نظر میں آپکی جو قدر و منزلت ہے۔ اسکا اظہار میں الفاظ سے کرنے سے قاصر ہوں۔ میری تمنا یہ ہے کہ آپ مجھے اپنی مخلصانہ دعاؤں میں رکھیں اور میرے عقد میں شریک رہیں۔ جلد ہی ویڈنگ کارڈ بھجوا رہی ہوں۔ ہاں آپ خالی ہاتھ نہیں آئینگے۔ میرے عقد کی تہنیت نظم کرکے لائینگے۔ میں اسے ایک اچھے دوست کا تحفہ سمجھوں گی یہی میری یادوں کا سہارا اور سرمایہ ہوگا اور بس!

اچھا اب اجازت چاہتی ہوں

خدا حافظ

آپکی رضیہ!

جاوید کے دل و دماغ پر بجلیاں سی کوند گئیں۔ قریب تھا کہ وہ چکرا کے گر پڑتا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا دیا۔ بیک وقت صراحی سے چار گلاس خالی کر دئیے۔ سیلنگ فیان کو تیز سے تیز تر کر دیا اور جاوید اسکے سامنے کھڑا اسکی بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔

جاوید کیوں پاگل ہوئے جا رہے ہو، تم نے رضیہ کو اپنا شریک زندگی بنانا چاہا مگر اسکا اظہار نہ کرکے بڑی بھول کی۔ یہ تو تمہارا ایکطرفہ فیصلہ تھا۔ کبھی رضیہ سے بھی پوچھ لیا ہوتا ؟؟۔ قصوروار تم ہو اور صرف تم!! بھلا اس بیچاری کا کیا قصور، وہ تو معصوم ہی رہی۔ جاوید نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاں ہاں! میں ہی قصوروار تھا۔ رضیہ تو معصوم ہی رہی۔ رضیہ! میری دوست! مجھے معاف کرنا! میں آؤنگا اور ضرور آؤنگا! اور ساتھ میں وہ منظوم نذرانہ بھی لاؤنگا کہ دنیا دنگ رہ جائیگی ۔۔۔!

شعر و سخن کی خیر و بقا کے لئے بشیر تیری حیات و خیر و بقا چاہتے ہیں لوگ

نذیر احمد رہبر

غزل

علامہ امیر علی خان یسیر

کٹھن مرحلے درمیاں اور بھی ہیں
رہِ شوق میں امتحاں اور بھی ہیں
کرو سوچ کر کارواں کا تعین!!
کہ بھٹکے ہوئے کارواں اور بھی ہیں
فشارِ غمِ دل سے گھبرا نہ جاؤ
یہاں تو غمِ جاوداں اور بھی ہیں
اگر مجھ پہ تم مہرباں ہو تو جانوں
مرے حال پر مہرباں اور بھی ہیں
ابھی دور ہے مجھ سے منزل یقیں کی
مقاماتِ وہم و گماں اور بھی ہیں
تیری رہگذاروں کے ذرے ہیں روشن
زمیں پر کئی کہکشاں اور بھی ہیں
نہ جانے مجھے کس جگہ عشق لایا،
یہاں ہمنوا ہم زباں اور بھی ہیں
مرے آشیاں ہی پہ گرتی ہے بجلی
اگرچہ یہاں آشیاں اور بھی ہیں
جنوں میرے ایثار کی ابتدا ہے
تقاضائے دردِ نہاں اور بھی ہیں
مرے سوز کی بات ان میں کہاں ہے
یہ مانا کہ آتش بجاں اور بھی ہیں

یسیر اپنے فن پر نہ کر نازِ بے جا
کہ تجھ سے بڑے نکتہ داں اور بھی ہیں

گرجتے بادل

سید محی الدین امجد

"دم نکل جائے مگر دم مارنا نہیں چھوڑتے بے وقوف کہیں کے —! اگر سگریٹ اتنا ہی عزیز ہے تو جاؤ تھوڑا تھوڑا کر کے مرنے سے بہتر ہے کہ زہر ہی پی لو—" نرملا نرس کی اس ڈانٹ سے وارڈ کے سارے مریض سہم گئے۔ بات صرف اتنی تھی کہ بیڈ نمبر ۱۱ والا مریض جو مرضِ دق میں مبتلا تھا عادت سے مجبور ہو کر سگریٹ پیتا ہوا نرملا کو نظر آ گیا۔ یوں جنرل ہسپتال کی سبھی نرسیں مریضوں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھتیں جنہیں "گھٹیا" ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر مریضوں کے ساتھ نرملا کا سلوک گھٹیا ترین تھا۔ جب کبھی کبھی مریض سے کوئی بے احتیاطی ہو جائے تو غصہ سے بے قابو ہو جاتی اور کڑوی کسیلی سناتی کہ بے چارہ مریض بوکھلا اٹھتا۔ اسپتال میں میرا نواں دن ہے ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق میں دل کے عارضہ میں مبتلا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اسپتال کے اس بیمار ماحول سے نکل جاؤں۔ لیکن ڈاکٹروں نے مجھے مکمل آرام مزید ایک ہفتہ قیام کا مشورہ دیا تھا۔

ایک رات سارے مریض اپنے اپنے بستروں پر لیٹ چکے تھے۔ نیند سے میری بھی آنکھیں بند ہو رہی تھیں کہ میرے پڑوس والا مریض کراہنے لگا۔ اسکی آواز نے پورے وارڈ کو بوجھل خاموشی سے چونکا دیا اور نرملا مخصوص انداز میں اسکی طرف انجکشن لے بڑھی — "ارے مرنا تو ہر ایک کو ہے —! اسطرح چیخ کیوں رہے ہو چپ رہو بے وقوف کہیں کے —" ! یہ کہتے ہوئے وہ انجکشن دینے لگی میں نے ایک نگاہ تمام مریضوں پر ڈالی سب ہراساں و پریشاں نظر آ رہے تھے۔ ہاسپتال کے ایک ہفتے کے تجربے میں میں نے یہ دیکھا تھا کہ جب کبھی کوئی مریض وارڈ میں دم توڑ دیتا تو سارے مریض بے چین ہو جاتے جیسے اب انکی باری آنے والی ہو!

باوجود انجکشن لگانے کے میرے پڑوسی مریض کے درد میں افاقہ نہ ہوا اور وہ بدستور چیختا رہا۔ اسکے بازو میں بیٹھی اسکی شریک حیات رو رو کر بیہوش ہو گئی تھی تھوڑی دیر بعد نرملا دو ڈاکٹرس کو لئے وارڈ میں وارد ہوئی ڈاکٹروں نے کچھ ٹیکے لگائے اور نرملا کو کچھ مخصوص ہدایات دیکر چلے گئے۔ نرملا مریض کو دوا پلانے لگی شاید دوا تلخ ہو اس وجہ وہ بار بار اگل رہا تھا۔ "ارے دوا پی لے۔ دوا ہی پی رہا ہے زہر تو نہیں — ؟ بے وقوف کہیں کے —" ؟ اسکی آواز گونجی۔ شب ہجراں کی طرح خدا خدا کر کے رات کٹ گئی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے اتنے میں ایک کربناک آہ

گونجی اور میرا پڑوسی مریض چل بسا سارا وارڈ ماتم کناں تھا سب مریض لاش کے گرد جمع تھے وارڈ کی نرسیں خاموش کھڑی تھیں ڈیوٹی نرس روم سے کسی کے رونے کی آواز آ رہی تھی میں نے بڑھ کر دیکھا تو نرملا دیوار کا سہارا لگائے زار و قطار رو رہی تھی۔ مجھ کو احساس ہوا کہ بعض اوقات گرجتے بادل برسا بھی کرتے ہیں ○○

کالی تصویریں

سائرہ ادیب

کالج کے سامنے کی سڑک، بس اسٹاپ پہ کئی رنگ کی تتلیاں بس کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ کالج کے دو لڑکے ایک لڑکی کے قریب سے گذر گئے۔ دراصل دونوں نے ٹکرانے کی سوجھی تھی مگر بن نہ پڑا۔ لیکن ایک نے اس جگھٹے سے آخر فائدہ اٹھا ہی لیا اور تھوڑی دور نکلنے کے بعد پلٹ کر دیکھا تو لڑکی کے چہرے پر کسی بھی قسم کا ردعمل نہ تھا۔ تعجب سے اپنے دوست سے پوچھا۔ یار کیا بات ہے! میں نے اتنی غلط حرکت کی پھر بھی وہ خاموش ہے۔۔۔؟ ارے یار کیا ہوا۔ تم نے برا تھوڑا ہی کیا ہے وہ زمانہ لد گیا جب اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کو لڑکیاں برا سمجھتی تھیں۔

بنس کالج کے دو طلباء کسی بہانے ویمنس کالج آئے ابھی کالج کی طرف بھی نہیں گئے کہ سامنے درختوں کے نیچے تین لڑکیاں بیٹھی گپ شپ کرتی دکھائی دیں۔ "ہائے کیا بات ہے ہیں ساتھ لے لو یہ کیا کر رہی ہو" دونوں لڑکے عارزومندی کے عالم میں ایک ساتھ کہتے ہوئے کلاس کی طرف بڑھ گئے۔ لڑکیاں تاڑ گئیں۔ جب یہ واپس ہو رہے تھے تو لڑکیوں نے آواز دی۔ "آ سنیئے۔۔۔!" دونوں طلباء بوکھلا اٹھے اس بوکھلاہٹ اور بھچکی پر لڑکیاں مسکرائیں۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں"۔ "جی، وہ! ایسا ہے کہ ہم کچھ کام کے سلسلے میں میڈم کے لیے آئے تھے وہ نہیں ہیں۔" "تو کیا ہوا" لڑکیوں کے ہونٹ کونوں سے کھل رہے تھے، اور نیچی پلکیں کھلتی جا رہی تھیں۔ "کیا مطلب" لڑکوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ دن کے اوقات میں لڑکیاں اتنا بھی نکل سکتی ہیں۔ "کیا آپ کنوارے ہیں؟" "صد فی صد" لڑکوں پر اب بیباکی سی آ گئی تھی۔ "اعتبار تو نہیں آتا پھر بھی" "ایسا کیجئے ہم تینوں میں سے کسی کو پسند کر لیجئے تاکہ شادی کر لیں۔ "شادی!! (یک دم چونک کر پھر سنبھل کر) ٹھیک ہے آپ اپنا پتہ دیدیجئے ہم آپ تک اپنا رشتہ بھیج دینگے بڑوں کے ذریعے۔" "ارے اسکی کیا ضرورت! آپ کے بڑے آئینگے تو خرچ دینا ہوگا۔ وہ! ہمارے پاس بس پاس ہیں آپ اپنا پتہ دیدیجئے ہم خود آ جائینگے۔ لڑکیوں نے فرانک ہو کر کہا۔ لیجئے نا۔ بسکٹ تو کھائیے۔ ہاں میں موجود بسکٹ پیکٹ انھوں نے بڑھا دی۔ اچھا تو اب اجازت دیجئے۔ اللہ حافظ

سیٹیاں سی بج رہی تھیں ــــــ ریڈیو اسٹیشن کے دارالترجمہ میں ایک خبر انگریزی میں آئی، Gang Rapingaminor girl اردو نیوز ریڈر نے آفس سکریٹری مس اوشا سے شرارتاً پوچھا۔ "دیکھئے اس کے کیا معنی نکلتے ہیں؟" "ارے اتنا نہیں سمجھتے، اجتماعی ریپ کیا مجھے ریپ کا ارادہ ہے؟؟" سامنے اوشا کی سوالیہ اور سنجیدہ آنکھیں تھیں اور ادھر پاؤں تلے کچھ نہ تھا!

ـــ ساگر کنارے ریت پر پکنک کو آئے ہوئے طلباء اور طالبات بیٹھی ہوئی ہیں ان کے ساتھ دو پروفیسر (میڈم اور سر) تھوڑی دیر بعد سارا مجمع منتشر ہو گیا کوئی چہل قدمی کر رہا ہے۔ کوئی گپ شپ میں مشغول۔ کوئی دور چمن کی سیر اور کوئی گروہ بے طرح کی گفتگو میں مصروف۔ لڑکیوں کا غول پانی میں اتر گیا ہے اور تصویروں کا مشغلہ جاری۔ اس سے پہلے اور ان سے دور دو لڑکوں نے تیرنا پسند کیا اور تیرنے لگے ایک کنارے پر لڑکیاں اور دوسرے کنارے پر یہ دونوں تیرتے رہے۔ جب ایک گھنٹہ بیت چکا تو پروفیسر صاحب نے چل نکلنے کو آواز دی۔ تمام گروہ در گروہ بس کی طرف جانے لگے، وہ دونوں ندی میں "میکس ریٹ" اسٹائل میں نکل ہی رہے تھے کہ لڑکیاں ادھر سے گذریں۔ "ہائے الو! دیکھ تو" واؤ کو لمبا کھینچ کر۔ اللہ ایک فوٹو لینے دینا۔ ترسی ہوئی آوازیں۔ میں لونگی نہیں میں

ـــ جب یہ گیٹ پار کر رہے تھے تو ان کے کانوں نے سنا پیچھے سے بیک وقت دیکھا تیور رہا ہے۔ محروم رکو تو! کلک۔۔ لڑکا تولیہ کی آڑ لے ہی رہا ہے کلک۔۔۔ کلک اور قریب سے کلک۔۔ زاویہ بدل کر کلک، میرا ذہن حیران ہے اور سوچیں بٹ رہی ہیں۔ آنکھوں کے رستے ذہن میں یکایک تصویریں گھس آئی ہیں کہ میری سانسیں چبھ رہی ہیں۔ ●●

غزل

ہزاروں عذر تراشے گئے نہ آنے کے ـــ!
کبھی نصیب نہ جاگے غریب خانے کے ـــ!
ہر اک بزم کو بخشی حیات نوا سینے ـــ!
مگر نصیب نہ جاگے مرے ٹھکانے کے ـــ!
اداس چہرے سے اظہار درد ہو کے رہا ـــ!
جتن ہزار کئے راز دل چھپانے کے ـــ!
ہمیں تو ایک ہی غم عمر بھر رہا ورنہ ـــ!
زمانہ اسکا ہوا اور وہ زمانے کے ـــ!
ثریا کر دیا الفت نے غم پسند ایسا ـــ!
کہ یاد ہی نہیں انداز مسکرانے کے ـــ!

ثریا کلیم بھدرک (اڑیسہ)

زخم اور ناخن

قیسی قمرنگری ایم اے

شاعر یا ادیب ہونے کے ناطے حق گوئی اور بے باکی سے روگردانی اپنے فرضِ اولین سے روگردانی کے مترادف نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ "زمانہ باتو نہ سازد تو زمانہ ساز" کے محاورے کا سہارا لے کر کوئی شاعر یا ادیب عہدِ حاضر کے خود ساختہ اصولوں کو ضرورتِ دنیا سمجھ کر برداشت کیے جانے کو اپنی مجبوری سمجھتا تو ہم ایسے شاعر یا ادیب کو شاعر یا ادیب نہ سمجھنے میں کسی طرح کی کوتاہی کرنا ہماری سب سے بڑی کوتاہی سمجھنے سے گریز نہیں کریں گے۔

یہی تو سبب ہے کہ ہم ہر اس شخص سے الجھ پڑتے ہیں جو ہمیں الجھا ہوا لگتا ہے اور اس معاملے میں ہمیں بزرگ وخورد، امیر وغریب کا پاس ولحاظ رکھنے کا قطعاً خیال نہیں آتا چاہے وہ الجھا ہوا شخص ہمارا عزیز ترین دوست ہو یا پھر ابا جان! ہم تو حق گوئی ہی کو شعار بنائیں گے۔

آپا جان کی شادی کے دعوت نامے جب طبع ہو کر آئے تو آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت اور شہر کے مشہور ترین کاتب کی فن خطاطی پر گھر کا ہر فرد اظہار مسرت کا روایتی فرض انجام دے رہا تھا۔ مگر ہم تھے کہ ابا جان سے الجھ پڑے کہ دعوت نامے میں لفظ "عقدِ مسعود" کیوں استعمال کیا گیا ہے؟ ۔۔ ابا جان بھی حسبِ عادت چیں بہ جبیں ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ " برخوردار! ہم نے بے شمار معزز شخصیتوں کے دعوت نامے پڑھے ہیں۔ شادی کے یہ دعوت نامے نوشاہ کی جانب سے ہوں یا دلہن کی "عقدِ مسعود" تو لکھا ہی جاتا ہے۔ اب یہ آپ نے کس عالم کا فتویٰ پڑھ لیا کہ اس لفظ کے استعمال پر اتنے پریشان ہو کہ مانو ہم نے آپ کی امّی کو طلاق دے دیا ہے"

ہم سے برداشت نہ ہوا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اپنے والد کے آگے زبان درازی بھی ایک غیر اسلامی فعل ہی ہے لفظ "عقدِ مسعود" کو غیر اسلامی ثابت کر لے گئے۔ "ابا جان "عقد" کے لفظی معنی ہیں "گانٹھ" کے اور آپ اس بات کو جھٹلا ہی نہیں سکتے کہ ہندوؤں میں بیاہ کے وقت نوشاہ جب اپنی دلہن کے گلے میں منگل سوتر پہناتا ہے تو لازمی ہے کہ اس منگل سوتر کو تین گانٹھ دے۔ اردو میں اسی رسم کو عقد کہا جاتا ہے۔ دلہا کو عاقد اور دلہن کو عاقدہ بھی کہتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ آپ آپا جان کی رسم عقد نہیں بلکہ خالص اسلامی طور پر نکاح پڑھوا رہے ہیں تو غیر اسلامی رسم کا اعلان چہ معنی دارد؟

کچھ دیر تو تو میں میں کے بعد ابا جان ہماری بات مان تو گئے لیکن دعوت ناموں کی دوبارہ طباعت سے صاف انکار کر دیا۔ یہ شعر پڑھ کر کہ ؎

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

یہ فطرتِ انسانی ہے کہ دانستہ غلطیوں کو دہرائے۔ یہی نہیں انسان اپنی تفہیم کے گلشن سے جب اپنے لیے خوب سے خوبصورت پھول چنتا ہے تو اسے چاہیے کہ دوسروں کے لئے کم از کم کانٹوں کا انتخاب نہ کرے لیکن فطرتِ انسانی کی اس غیر انسانی حرکت کو کیا کیا جائے کہ ایک لاکھ بچاسی ہزار پیغمبروں سے بھی اس کا سدھار ممکن نہ ہو سکا۔ اور یہ آج بھی خود پرستی کے جام سے خود غرضی کی شراب نوش فرمانے میں بری طرح مصروف ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مسجد میں سجدہ ریزی بھی اپنے خالق کی اطاعت کی بجائے جنت کی ہوس بن کر رہ گئی ہے۔ زہد وتقویٰ اس حد تک مجبور ہو گئے ہیں کہ آج کے انسان کا حسنِ دنیوی سے منہ موڑنے کے لیے

جنت کی حوروں کا لالچ دینا پڑے۔

آپا جان کی شادی کے وقت دولہے والوں نے پچیس ہزار روپئے جوڑے کی رقم کا مطالبہ کیا تو ابا جان نے سچے مسلمان ہونے کا ثبوت اس طرح پیش کیا کہ چارپائی پر لیٹ کر امی جان کو لکچر پلانے لگے کہ "مسلمان کسقدر بدل گئے ہیں۔ پہلے دلہا، دلہن کو نذرانہ دیا کرتا تھا اب دلہن دلہے کو خرید رہی ہے۔" اور امی جان بھی ہاں میں ہاں ملاتی گیئں کہ " اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو وہ دن دور نہیں کہ مسلمان اپنی نومولود لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا شروع کردیں۔"

ہمیں آج بھی یاد ہے کہ جوڑے کی رقم ۲۵ ہزار روپئے اور جہیز وغیرہ کی یکجائی میں امی جان کے سارے زیور، ابا جان کی کل پونجی اور ہمارا اپنا ذاتی مکان بھی نذر ہوگیا۔ لیکن آج جب ہمارے رشتے کی بات چلی تو ابا جان اور امی جان نے گذشتہ مصائب و آلام کو اس طرح بھلا دیا جیسے کسی سیاسی قائد نے قبل از انتخاب کئے گئے وعدے بعد از اقتدار بھلا دئے ہوں۔ شہر کے مشہور وکیل سید مصلح الدین صاحب کی چوتھی لڑکی سے جب ہماری شادی کی بات چھڑی تو ابا جان نے ایک لاکھ روپئے جوڑے کی رقم کا مطالبہ کر دیا۔ وائے برما و برحالِ ما۔ ابا جان نے یہ نہیں سوچا کہ آپا جان کی شادی کے وقت ۲۵ ہزار روپئے جمع کرنے میں جو دقت انہیں درپیش آئی تھی وہ سید مصلح الدین صاحب کو ایک لاکھ روپئے کی یکجائی میں بھی پیش آسکتی ہے۔ ہم میں قوت برداشت بہت کم ہے۔ آخر اس غیر اسلامی رسم کا تدارک ہم جیسے نوجوان نہ کریں تو کون کرے۔ ان معاملات میں اگر ہم ہونٹ سی لیں تو یہ رسم بڑھتے بڑھتے اسلامی سماج کے جسم کا ناسور بن جائے گی اسی لئے ہم نے ابا جان سے صاف صاف کہدیا کہ ہم بیاہ رچائنگے تو بغیر جوڑے کی رقم اور جہیز لئے، ورنہ زندگی بھر خود کو کنوارہ کہلانے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ابا جان نے ہماری ایک نہیں مانی۔ وہ اسی بات پر ڈٹے رہے کہ زمانے کی روش کو بدلنا اتنا آسان نہیں۔ انہوں نے شادی کی بات خود کی ہے لہٰذا اب وہ سید مصلح الدین صاحب کے پاس جاکر دوبارہ اپنے لاڈلے کی اس حماقت کا اظہار نہیں کریں گے کہ وہ اپنے ہونے والے خسر کا پیسہ بچانا چاہتا ہے۔ ابا جان کی گفتگو سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ آپا جان کی شادی کے وقت اٹھائے گئے مصائب و آلام کا سید مصلح الدین صاحب سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اگر اسی طرح جاری رہا تو مسلمانوں کی ساری معیشت تباہ و برباد ہو جائے گی۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ سید مصلح الدین صاحب سے خود ملیں اور اپنے فیصلے سے آگاہ کریں۔

سید مصلح الدین صاحب کے چیمبر پر بے حساب لوگ جمع تھے۔ شاید ہر کوئی اپنی اپنی باری کا منتظر تھا ہمیں دیکھتے ہی ان کے مددگار نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور ہمیں وکیل صاحب کے کیبن میں لے گئے۔ شاید وہ روبرو تشریف فرما سوٹ والے صاحب سے کسی اہم معاملے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے، ہمیں دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ اور آئی۔ اور انہوں نے اسی مصنوعی مسکراہٹ کے سہارے ہمیں کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ فرمایا پھر اپنے موکل سے مخاطب ہوئے "مسٹر خان! ان سے ملئے یہ ہمارے ہونے والے داماد ڈاکٹر سلیم ہیں"، اس سوٹ والے شخص نے بڑے تپاک سے ہاتھ بڑھایا اور پرجوش مصافحہ کے بعد وکیل صاحب سے دبی آواز میں بولا" وکیل صاحب! آپ تو دامادوں کے انتخاب میں لاثانی ہیں۔ آپ کے تینوں داماد تو قابلِ رشک ہیں ہی۔ اب چوتھے داماد بھی ماشاء اللہ" یہ جملہ تو اس نے اونچی آواز میں کہا لیکن سرگوشی میں وکیل صاحب سے بولا" کتنا دے رہے ہیں؟" ہم سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے شاید وکیل صاحب نے اپنی کلمہ کی انگلی اٹھائی پھر ذرا اونچی آواز میں بولے" یم بی بی ایس، فرسٹ کلاس میں نکالا ہے برخوردار نے" اور سوٹ والا شخص فوراً کہہ اٹھا۔ اب آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب آپ نے ایک نے ایک انگلی اٹھائی ہے تو برخوردار کروڑوں کی صلاحیت کے مالک ہو گئے ہی" اور ایک بے معنی سا قہقہہ لگا کر اٹھ کھڑا ہوا اور خدا حافظ کہہ کر نکل پڑا۔ اتنے میں چائے آگئی۔ وکیل صاحب نے چائے

کی چسکی لی اور ہمیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ہم نے تھرائی ہوئی آواز میں اپنی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ "وکیل صاحب! دراصل میں جہیز اور جوڑے کی رقم کا مخالف ہوں۔ آپ سے یہی گذارش کرنے آیا تھا کہ کم از کم آپ مجھے اس لعنت سے نجات دلائیں"۔ ہمارے بیان اور اندازِ بیان پر وکیل صاحب مسکرا اٹھے۔ پھر چائے کی پیالی نیچے رکھتے ہوئے بولے۔ "برخوردار آپ کے جذبے اور جرأت کی ستائش نہ کروں تو احمق کہلاؤں لیکن تائید کروں تو بھی احمق کہلاؤں" وکیل صاحب کا جواب ہماری سمجھ میں نہ آسکا اور ہم انہیں گھورتے رہ گئے۔ ہماری اس حالت کو سمجھ کر انہوں نے استفسار فرمایا "دیکھو ابھی بیرسٹر خان سے جب میں نے اشارتاً کہا کہ جوڑے کی رقم ایک لاکھ روپئے دے رہا ہوں تو انہوں نے تمہاری قیمت کروڑوں کی لگائی۔ اگر میں یہ کہتا کہ جوڑے میں کچھ نہیں دے رہا ہوں تو ظاہر ہے وہ یہ سمجھتے کہ کوئی اُلو گٹھ گیا۔ بلکہ دنیا والے یہاں تک کہدیں گے کہ لڑکے میں یقیناً کچھ نہ کچھ نقص ہوگا ورنہ ایک لاکھ روپئے اس زمانے میں کون چھوڑتا ہے اس طرح تم بھی بدنام ہو جاؤ گے اور ہم بھی حقیر۔ اب جاؤ اپنے والد کو بھیجو میں انہیں سمجھاؤں گا"۔ ہم وکیل صاحب کے چیمبر سے چلے آئے اور یہ سوچنے لگے کہ اگر جوڑے کی رقم قبول کر لوں تو گنہگار کہلاؤں ورنہ زمانہ کہے گا کہ اس نوجوان میں یقیناً کوئی نقص ہے۔

ہماری انگلیوں پر شرافت، مذہبیت اور انسانیت کے ناخن تو اُگ آئے ہیں لیکن ساتھ میں سر پر رسوم و رواج کا زخم اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ مندمل ہونے میں زندگی کٹ جائے۔ وقت کی نزاکت تو یہی کہتی ہے کہ ناخن ہی کاٹ دو۔ گناہوں کے حساب کا خوف زمانے کے خوف کے نیچے دب ہی جائے گا ○○

آپ کی الجھنیں

یونس انجم

سکون و راحت سے محروم، نت نئے مسائل اور بے شمار الجھنوں کی وجہ سے بے حد پریشان، آج کے انسان کو اگر صحیح وقت پر رہنمائی اور مناسب مشورہ نہ ملے تو وہ اور بھی گھبرا جاتا ہے خود کو دھرتی کا ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر ہم نے یہ مفید کالم شروع کیا ہے۔ اس کالم کے تحت نفسیاتی، مذہبی اور سماجی مسائل کے سلسلے میں مناسب مشورے دئے جائیں گے۔ اپنے مسائل اس پتہ پر لکھئے۔

آپ کی الجھنیں
ماہنامہ پیکر خوشبو
30/109 چار اسٹریٹ کرنول

الجھن:۔ ب۔ ت۔ کرنول۔ بہت دنوں سے میں ایک الجھن میں گرفتار ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ براہ کرم میری الجھن کا آپ حل بتائیں۔ میں بی۔ اے کے سال اول میں پڑھ رہی ہوں۔ بچپن میں چیچک کا شکار ہوئی جس کے نشانات آج بھی میرے چہرے پر موجود ہیں۔ جب بھی میں آئینہ کے سامنے جاتی ہوں تو مجھکو لگتا ہے کہ۔ جیسے آئینہ مجھ سے کہہ رہا ہو کہ "میں بد صورت ہوں" اسی لئے آئینہ کے سامنے جانے سے کتراتی ہوں۔ کالج میں بھی سب سے الگ تھلگ رہتی ہوں۔ لوگوں کی بھیڑ میں، سہیلیوں کی جھرمٹ میں جانے سے دل گھبراتا ہے۔ ہر وقت اپنی بد صورتی کا احساس چھایا رہتا ہے ہمیشہ اداس رہتی ہوں۔ میں ایک مذہبی گھرانے کی لڑکی ہوں۔ نماز روزہ کی پابند ہوں۔ دنیا تو اچھی صورت پر مرتی ہے۔ مجھ بد صورت کو کون پوچھیگا۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟

جواب:۔ سب سے پہلے آپ اپنے اس خیال کو دل سے مٹا دیجئے کہ آپ خوبصورت نہیں ہیں۔ رنگ و روپ ہی سب کچھ نہیں ہوتا کتنے ہنستے مسکراتے چہرے بھی اپنے اندر بہت سارا غم رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی بھی انسان تمام خوبیوں کا مالک نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی میں کوئی کمی ضرور رہتی ہے۔ کالج میں پڑھنے والی سبھی لڑکیاں خوبصورت ایکٹریس نہیں ہوتیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ نماز روزہ کی بھی پابند ہیں۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے خدا کی یاد میں مشغول رہنے والے چہروں پر تو بہت ہی نور ہوتا ہے۔ عبادت کرنے والے چہروں کو کسی پوڈر کسی کریم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ زیادہ حسین اور خوبصورت نظر آنے کی کوشش میں دن رات میک اپ کرنے والی ان لڑکیوں کے دل کتنے میلے ہوتے ہیں۔ خوبصورت چہروں پر مت جائیے۔

آپ پردے سے نکلنے کی نہ کوشش کیجے بوند جو سیپ میں رہتی ہے گہر ہوتی ہے

قیصی قمرنگری

خوبصورتی صرف رنگ و روپ ہی کا نام نہیں ہے۔ اخلاق محبت ملنساری انسان کی شخصیت میں چار چاند لگادیتی ہے۔ ایک بدصورت انسان اپنے اچھے کردار سے ملنے جلنے والوں کا دل جیت لیتا ہے۔ آپ یہ بھول جائیے کہ آپکے چہرے پر چیچک کے نشانات ہیں۔ ہلکی پھلکی خوشبو لگا لیجئے اور جب بھی آئینہ کے سامنے جانا پڑے تو یہ خیال کیجئے کہ آپ بدصورت نہیں ہیں ہمیشہ گھر کے کسی نہ کسی کام میں مشغول رہیئے زیادہ سوچیئے مت۔

الجھن ۔ب ۔ د ۔ کرنول ۔ میں اکثر پریشان رہتا ہوں خواہ مخواہ گھبراہٹ مجھ پر طاری رہتی ہے۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ حالانکہ میری خواہش ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح میرے بھی دوست ہوں جو دکھ سکھ میں میرا ساتھ دیں۔ کسی بھری محفل میں جانے سے ڈرتا ہوں۔ تنہا اور اکیلا رہنا مجھکو زیادہ پسند ہے۔ بھیڑ اور گڑبڑ سے مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ جب تک اس دنیا میں رہوں اسلام کی اور سماج کی خدمت کرتا رہوں۔ لیکن سماج کے کسی پروگرام میں حصہ لینے کی ہمت نہیں ہوتی سب سے الگ تھلگ رہتا ہوں کسی سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ بتائیے کیا کروں۔؟

جواب :۔ آپ بنیادی طور پر خود اعتمادی سے محروم ہیں اسی لئے الگ تھلگ رہنا آپکو زیادہ پسند ہے آپ کے اندر حقیقتوں سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہے۔ جب تک آپ اپنی فکر اپنی سوچ میں تبدیلی نہیں لائینگے آپ یونہی بے لطف زندگی گذارتے رہینگے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپکا کوئی دوست نہیں ہے۔ حالانکہ آپکی خواہش ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح آپکے بھی دوست ہوں جو دکھ سکھ میں آپکا ساتھ دیں۔

میرے بھائی ۔ صرف خواہش کرنے سے کوئی دوست نہیں بنتا صرف آرزو کرنے سے خوشی نہیں ملا کرتی۔ کسی کو اپنا دوست بنانے سے پہلے خود کو ایک بہترین اور کامیاب دوست بننا چاہئے۔ اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب آپ دوسروں کے دکھ سکھ میں کام آئیں۔ خالی خولی باتوں سے کسی کا دل نہیں جیت سکتے۔ افلاطون نے کتنا سچ کہا ہے کہ "بدنصیب ہے وہ شخص جسکا کوئی دوست نہ ہو" جو لوگ سماج سے کٹے کٹے سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ دراصل بیمار اور خود غرض ذھن کے ہوتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر میں کسی سماجی پروگرام میں حصہ لیتا ہوں تو مجھکو کیا ملتا ہے۔ اس قسم کے انداز سے سوچنے والے زیادہ ترقی نہیں کر پاتے۔ جو لوگ سماج کو کچھ نہیں دیتے ، سماج بھی انھیں کچھ نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر چور ، غنڈے سماج کو کچھ نہیں دیتے بلکہ سماج سے چھینتے ہیں اسی لیئے سماج انھیں کچھ نہیں دیتا۔ دن کے اجالے میں سماج سے آنکھیں نہیں ملا سکتے۔ اپنے اڈوں اور ٹھکانوں میں چھپے

پیکر خوشبو

کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ

بھارت ٹائپ رائٹنگ اینڈ شارٹ ہینڈ انسٹی ٹیوٹ

چوک سرکل، کرنول

رہتے ہیں۔ رات کے اندھیروں ہی میں وہ اپنے اڈوں سے باہر نکلتے ہیں۔ دن میں دنیا والوں کو اپنا چہرہ دکھانے کے قابل نہیں ہوتے سماج کو کچھ نہ دینے والے افراد ذلیل ہی ہوا کرتے ہیں۔

آپ اپنے سوچنے کی انداز میں تبدیلی لائیے۔ آپکو لوگوں سے ملنے سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ آپ انسانی مہذب سماج میں رہتے ہیں۔ خونخوار بھیڑیوں کے درمیان نہیں۔ خوامخواہ کے خوف کو آپ نے دل میں جگہ دے لیا ہے۔ آپ روزانہ غسل کیجئے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنئے ہلکی پھلکی ورزش کیجئے اور ایک بہترین دوست بننے کی کوشش آج ہی سے شروع کر دیجئے ــــ

خون کی قیمت

یس رضاء الرحمٰن

بہت سارے لوگ چوراہے کے قریب والے بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہے تھے ــــ

دفعتًا چوراہے پر کھڑے ہوئے پولیس کے وزل کی آواز کا تسلسل تمام کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے لگا بس کے انتظار میں کھڑے لوگ متحرک ہو گئے اور چوراہے پر جمع ہونے لگے۔ لوگوں کے بڑبڑانے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ حادثہ ہوا ہے۔ لاری کے اطراف کھڑے ہوئے لوگ ڈرائیور کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ سالے شراب پی کر گاڑی چلاتے ہیں۔ ان سالوں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ان نالائقوں نے زندگی دوبھر کر رکھی ہے جدھر دیکھو حادثہ ــــ اس اژدھام کی کوکھ سے ایک جوشیلی آواز پیدا ہوئی۔ مارو سالے کو دیکھتے کیا ہو۔ پولس آنے تک مجمع اپنے غصہ کی آگ کو ٹھنڈی کر چکا تھا۔ ڈرائیور کی لاش خون میں لت پت پچھلے ٹائر کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف ڈرائیور کا خون بہہ رہا تھا اور دوسری طرف گدھے کا خون۔ چوراہے پر گدھے کے خون کی دھاریں اور ڈرائیور کے خون کی دھاریں آپس میں گلے مل رہی تھیں۔ انسانوں کی اس غیر انسانی حرکت پر خوش ہو کر۔ پولیس کانسٹبل نے ڈرائیور کو ٹھوکر لگاتے ہوئے زہر خندگی کے ساتھ کہا۔ "سالا ڈرائیور گدھا ہے گدھے کو روند کر رکھ دیا سالے نے۔ لوگوں نے اچھی سزا دی سالے کو۔ دوسروں کو عبرت آئے گی۔

غزل
خلیل تبسم (گنتکل)

تمہاری یاد سے لہراتا ایک اک پل ہے
بہت حسین مری زندگی کا آنچل ہے

ہر ایک شخص یہاں سر بریدہ پھرتا ہے
یہ شہر، شہر نہیں شخصیت کا مقتل ہے

ترے خلوص کی بارش کہاں کہاں برسی
نظر نظر کی ڈگر آنسوؤں سے جل تھل ہے

بھٹک سکو مرے ہمراہ تو چلو تم بھی — !
مرے مزاج میں آوارگی کا بادل ہے

تمہارے شہر، مبارک تمہیں کو اے لوگو !
مرے نصیب میں لوٹی [illegible] کا جنگل ہے

پہنچنا چاہو تو مجھ تک پہنچ نہ پاؤ گے
چہار سو مری تنہائیوں کا دلدل ہے

بلا سبب ہے جو روٹھا ہوا تبسم سے
وہ آدمی تو ہے لیکن ذرا سا پاگل ہے

غزل
عثمان شاہین (کرنول)

تری جدائی نے بخشی ہے یاد کی خوشبو
خریدتا رہا ہر شب کو اک نئی خوشبو

چمن چمن سے کئی پھول میں نے جمع کئے
کسی میں بھی نہ ملی تیری زلف کی خوشبو

نہ جاؤ چھوڑ کے کھو جائے گا وقار وجود
ہوئی جو تن سے جدا روح تو نہ لوٹے گی

نکل کے گل سے کبھی واپس نہ آسکی خوشبو
تجھے بھلانے کی خاطر جو مئے کشی کی تھی
ہر ایک جام سے آتی رہی تری خوشبو

مری حیات کے خلوت کدہ میں اے شاہین
بھلائی جا نہ سکی اس کی یاد کی خوشبو

مطبوعہ: اعجاز پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد